اسلامی معاشی اقدار اور اجتہاد کی اساس

ڈاکٹر رفیق احمد

زیرِ نظر مقالے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ جدید زمانے کے معاشی مسائل کی وسعتیں اور پیچیدگیاں اتنی زیادہ ہیں کہ انھیں تسلی بخش طور پر حل کرنے کے لیے مسلمان علماء اور ماہرینِ اقتصادیات کو اجتہادی بصیرت سے کام لینا پڑے گا ۔ لیکن یہ بصیرت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک دوسرے عالمی نظاموں کے مقابلے میں اسلام کی معاشی قدروں کا صحیح ادراک حاصل نہ کیا جائے ۔ یہ معاشی قدریں کیا ہیں اور انسان کی جدید معاشی اور سماجی زندگی سے ان کا کیا تعلق ہے ۔ یہی وہ سوالات ہیں جن پر اس مضمون میں بحث کی گئی ہے ۔

اس وقت دنیا بھر میں احیائے اسلام کی جو تحریکیں جاری ہیں ان کی فروغ پذیری اور کامیابی کا دارو مدار بہت حد تک اس بات پر ہوگا کہ مسلمان ممالک اسلام کی انسانیت ساز ابدی قدروں کی روشنی میں کس حد تک اور کتنی تیزی سے اپنے عظیم معاشی وسائل کو بروئے کار لا کر اپنے کروڑوں توحید پرست عوام کو ایک اعلیٰ معیار زندگی سے ہم کنار کرتے ہیں ۔ یہ کام بے حد اہم بھی ہے اور دشوار بھی ، اس کی فوری اہمیت تو اس امر سے واضح ہے کہ سائنس ، ٹیکنالوجی اور ذرائع ابلاغ کی فتوحات نے اسلامی دنیا میں ایک زبردست معاشی ، سیاسی اور قانونی بیداری پیدا کر دی ہے ۔ اگرچہ اس بیداری کا محور اسلام ہے لیکن اس کا فوری اثر معاشی مسئلہ کی شکل میں ظاہر ہوا ہے ۔ لوگ غربت و جہالت سے نجات اور عدل و انصاف اور مساوات کی بنیاد پر معاشی رزق میں اضافہ چاہتے ہیں ۔ اس کے برعکس دشواری یہ ہے کہ اسلام کا اقتصادی پہلو حال ہی میں مسلمان مفکرین کی توجہ کا مرکز بنا ہے

اور ابھی اسلامی اقتصادی نظام نے کوئی ٹھوس اور مربوط امتیازی شکل اختیار نہیں کی - مسلمان ممالک ہنوز سوشلزم، سرمایہ داری اور ملے جلے معاشی نظاموں کے تکلیف دہ تجربات کر رہے ہیں - ان حالات میں یہ امر بے حد ضروری ہے کہ عہد حاضر کے معاشی اور سماجی تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسلامی اقتصادی قدروں کی نشان دہی کی جائے اور ان قدروں کی روشنی میں اسلامی اقتصادی نظام کے بیرونی ڈھانچے کو مدون کرنے کی اجتہادی کوششوں کا آغاز کیا جائے -

اسلامی معاشی اقدار پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ عام معاشی نظاموں کی ایک اہم خصوصیت بیان کر دی جائے - ہر معاشی نظام دو ڈھانچوں پر مشتمل ہوتا ہے - ایک بیرونی اور دوسرا اندرونی - بیرونی ڈھانچہ ان بے شمار تنظیموں، اداروں اور پیشوں سے متشکل ہوتا ہے جو وسائلِ رزق کی پیداوار اور تقسیم کا کام سرانجام دیتے ہیں - اس کے برعکس اندرونی ڈھانچے سے مراد وہ اقدار ہیں جو بیرونی ڈھانچے کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں - ان اقدار سے مراد مجموعی انسانی زندگی کے بارے میں وہ افکار و خیالات ہیں جنھیں کوئی انسانی گروہ اپنا لیتا ہے اور جن پر اپنے اعمال و کردار کی بنیاد رکھتا ہے -

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کوئی معاشی نظام اپنا الگ وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ ایک وسیع تر تہذیبی وجود کا محض ایک پہلو ہوتا ہے جس کا کام یہ ہے کہ انسانوں کی ضروریات اور آسائشات کو پورا کرنے کے لیے وسائل کو استعمال کرنے کے متبادل طریقے متعین کرے - انہیں طریقوں کو معاشی جدو جہد سے تعبیر کیا جاتا ہے - اس جدو جہد کا اظہار کچھ تو اقوام کے آئے دن کے قوانین کی صورت میں ہوتا رہتا ہے اور کچھ ان روایات و رسوم کی شکل میں جن کا تعلق تحصیل معاش سے ہے - قوانین کو نسبتاً آسانی سے تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن روزی کمانے کے قائم شدہ طور طریقے کسی شکل میں مدت تک قائم رہتے ہیں، چاہے حکومت کے ڈھانچے میں کتنی ہی تند و تیز تبدیلیاں کیوں نہ کی جائیں - وجہ یہ ہے کہ یہ طور طریقے ان اقدار و روایات کا عکس ہوتے ہیں - جنھیں تاریخ نے قومی مزاج کا جامہ پہنایا ہوتا ہے - پرانی اقدار کو نئی اقدار ہی بدل سکتی ہیں بشرطیکہ وہ انسانوں کی ترقی و تعمیر کے لیے زیادہ مؤثر اور مددگار ہوں - اگر ایک بار زندگی سے متعلق اقدار کو تبدیل کر دیا جائے اور یہ عمل بتدریج ہی ہو سکتا ہے تو ایسی صورت میں نظام معیشت بھی لازماً متاثر ہوتا ہے کیونکہ یہ نظام خود وسیع تر نظام زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے -

کسی بسیار پہلو جوہر پارے کی طرح اقدار کے بھی کئی پہلو ہوتے ہیں - سیاسی اقدار، معاشی اقدار، اخلاقی اقدار، قانونی اقدار، روحانی اقدار، معاشی اقدار، لیکن ان سارے پہلوؤں میں باہمی ربط کوئی نہ کوئی مرکزی فلسفۂ زندگی پیدا کرتا ہے - مثال کے طور پر اگر ہیگل اور کارل مارکس کی پیروی کرتے ہوئے زندگی کے

بارے میں یہ نظریہ قائم کیا جائے کہ یہ جنگِ اضداد سے فروغ پاتی ہے جس میں ہر تصور یا مادی نظام اپنی ضد پیدا کرتا ہے اور پھر اضداد کی اس جنگ و جدل سے ایک نیا مرکب تصور یا مادی نظام ظہور میں آتا ہے تو ایسی حالت میں پوری انسانی تاریخ دو خونریز قوتوں کے درمیان کشمکش سے عبارت نظر آتی ہے - جس میں ہر فریق دوسرے کو فنا کرنے یا اس پر غلبہ پانے اور اس غلبہ کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے - چنانچہ تمدن و مذہب ، سیاست و معیشت ، معاشرت و اخلاق سب کے سب اسی مقصد کے تابع ہو جاتے ہیں - اس کے برعکس اگر ڈارون کے نظریۂ بقائے اصلح کو زندگی کی بنیاد بنایا جائے تو پھر سیاسی اور اقتصادی نظام طبقاتی کشمکش کی بجائے بے رحم آزادانہ مقابلہ بازی کی اساس پر استوار ہوتا ہے - طلب اور رسد کی قوتوں میں کھلا مقابلہ ، آزادانہ تجارت ، غیر محدود انفرادی ملکیت ، محدود سرکاری مداخلت ، تمام معاشی کارروائیاں انھی معاشی اقدار کا عکس پیش کرتی ہیں - ان دونوں نظریوں کے مقابلے میں اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ اس کائنات کا خالق ایک زندہ و فعال خدا ہے جو اس کی نشو و نما کر رہا ہے اور جس نے انسان کو ایک احسن مخلوق بنا کر قدرتی طاقتیں اس کے تابع کر دی ہیں تاکہ '' لتركبن طبقاً عن طبق'' [۸۴ : ۱۹] کے بموجب ترقی و عروج کی تمام مادی اور روحانی منزلیں طے کرے تو پھر جو معاشرہ تعمیر ہوگا اس میں طبقاتی چپقلش اور بے رحم مقابلہ بازی کی بجائے باہمی تعاون ، عدل و انصاف ، بلا تمیز رنگ و نسل ، فلاح و بہبود اور مساواتِ حقوق بنیادی اقدار متصوّر ہوں گے اور ان کی بنیاد پر جو معاشی ڈھانچہ ابھرے گا اس کے خط و خال چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ انھی اقدار کا آئینہ دار ہوگا ، جو انسان کے حسنِ تخلیق کو اُجاگر کرتی ہیں اور اس کی آب و تاب کو مسلسل بڑھاتی رہتی ہیں -

ماہرینِ اقتصادیات نے اقدار کی اہمیت کو حال ہی میں تسلیم کیا ہے - اس میں شک نہیں کہ ایڈم سمتھ ، ریکارڈو اور مل ایسے کلاسیکی معیشت دانوں نے اپنی تحریروں میں معاشرتی اور تہذیبی اقدار کی طرف اشارے کیے ہیں اور بعد کے مفکرین نے بھی انھیں یکسر نظر انداز نہیں کیا - لیکن نقطۂ نظر میں تبدیلی دوسری جنگ عظیم کے بعد پیدا ہوئی ہے - ایشیا اور افریقہ میں آزادی کی شکل میں جو عظیم سیاسی تغیر رونما ہوا ہے اس نے کروڑوں انسانوں کی شدید غربت کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ اس ضرورت کا احساس دلایا ہے کہ ہمہ گیر معاشی خوشحالی کم سے کم مدت میں حاصل کی جائے - چنانچہ ماہرین اور مفکرین ان عوامل کی تلاش میں سرگرداں ہیں جن پر عمل کر کے ذلّت آمیز غربت سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے - اس تلاش نے علم اقتصادیات کی اس جدید شاخ کو جنم دیا ہے ، جسے ترقیاتی معاشیات کے نام سے پکارا جاتا ہے اور جس پر پچھلی تین دھائیوں میں سیکڑوں بلند پایہ مقالے اور کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں اور مزید تحقیق و تجسس کا عمل جاری ہے -

ترقیاتی معاشیات کے مباحث میں قومی اقدار و روایات کو نمایاں مقام دیا جا رہا ہے ۔ اس بارے میں عام طور پر اتفاق رائے ہے کہ کسی اقتصادی نظام کی افادیت دو طرح سے ظاہر ہوتی ہے ۔ ایک اس بات سے کہ اس نے عوام کو کتنی معاشی اشیاء اور خدمات بہم پہنچائی ہیں اور دوسری اس امر سے کہ ان اشیاء اور خدمت کی مزید پیداوار اور منصفانہ تقسیم کس رفتار سے ہو رہی ہے ۔ یعنی معاشی فلاح و بہبود کی موجودہ سطح کیا ہے اور اس میں اضافہ کس رفتار سے ہو رہا ہے ۔ لیکن معاشی خوشحالی کی سطح اور رفتار اضافہ از خود متعین نہیں ہوتیں بلکہ ان پر کچھ عوامل اثر انداز ہوتے ہیں ۔ ماہرین نے اس سلسلہ میں پانچ اہم عوامل کی نشان دہی کی ہے ۔ اول : موجودہ قدرتی وسائل سے کس حد تک استفادہ کیا جا رہا ہے ۔ دوئم : آبادی کا کتنا حصہ تربیت یافتہ ہے اور مؤثر طور پر برسر روزگار ہے ۔ سوئم : صرف دولت کی عادات کیسی ہیں ۔ قوم کتنا بچاتی ہے اور کتنا سرمایہ لگاتی ہے ۔ چہارم : قوم نے کارآمد علوم و فنون کا کتنا ذخیرہ جمع کیا ہے اور اسے کس حد تک استعمال کیا جا رہا ہے ۔ پنجم : زندگی کے بارے میں لوگ کیا نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور کن اقدار و افکار کو اپنے اعمال کی بنیاد بناتے ہیں کیونکہ انھیں اقدار کی بنا پر معاشی اشیاء اور خدمات کی پیداوار اور تقسیم کے بارے میں قومی نقطۂ نظر متعین ہوتا ہے ۔ معاشی ترقی کے بارے میں جو مختلف نظریے یا ماڈل (یعنی فکری سانچے) تیار کیے گئے ہیں ان میں یہ بات صریحاً تسلیم کی گئی ہے کہ اقدار خواہ معاشی ہوں یا غیر معاشی باقی چار عاملین ترقی کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

اقدار کے بارے میں تمہید قدرے طویل ہوگئی ہے لیکن اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض حلقوں کی یہ رائے کہ اسلام نے کوئی مربوط و منظم اقتصادی نظام پیش نہیں کیا ، اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے معاشی جد و جہد کی اساس کو نہیں سمجھا ۔ دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہوتی کہ کسی قوم کی معاشی جد و جہد کا بیرونی ڈھانچہ کیا ہے یا کوئی نظام فکر کس قسم کا بیرونی معاشی ڈھانچہ تعمیر کرنا چاہتا ہے ۔ تجزیہ اس بات کا کرنا چاہیے کہ معاشی ڈھانچے کی بنیاد کن اقدار پر ہے یا ہوگی ۔ بیرونی طور پر تو آج کل کے مختلف معاشی نظام کئی مشترکہ خصوصیات رکھتے ہیں ۔ وہی چھوٹے اور بڑے پیمانے کی صنعتیں ، وہی سلسلہ وار دکانیں ، وہی جدید معاشی پیشے اور فنون ، وہی تنظیمی مسائل ، وہی سرکاری اور نجی شعبوں کی تقسیم ۔ وہی سائنسی اور فنی تحقیقات ، وہی منصوبہ بندیاں ، کہیں کم اور کہیں زیادہ ۔ لیکن اگر کوئی چیز ان نظاموں میں فرق ظاہر کرتی ہے تو ان کی بنیادی اقدار ہیں جو ان کے معاشروں کے اقتصادی اور غیر اقتصادی پہلوؤں میں ربط پیدا کرتی ہیں ۔ لہٰذا اسلام سے کسی مخصوص نظام معاش کو طلب کرنے کے بجائے اس کی بنیادی اور معاشی اقدار کو سمجھنا چاہیے ۔ یعنی ان اقدار کو جن کی پیروی بہرحال لازم ہے خواہ بیرونی معاشی ڈھانچہ کسی شکل کا کیوں نہ تعمیر کیا جائے ۔ دوسرے نظاموں سے تقابل بلحاظ اقدار ہونا چاہیے ، نہ کہ بلحاظ تنظیم ۔

اسلام ایک مکمل اور مربوط نظام اقدار رکھتا ہے : "**الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا**" [۵ : ۳] - اس آیت میں اسلام کے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ بھی بڑی حد تک اقدار کے نقطۂ نظر سے ہے - انسانی زندگی بہت سے پہلو رکھتی ہے - سیاسی ، سماجی ، معاشی ، اخلاقی ، نفسیاتی اور روحانی - جدید زمانے میں معاشرتی علوم کی بڑھتی ہوئی تعداد اس بات کی دلیل ہے کہ چونکہ انسان خود ایک اکائی ہے لٰہذا اگر اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں کوئی باہمی رابطہ پیدا نہ کیا جائے تو پھر وہ تضاد کا شکار ہو جاتا ہے اور اگر اس قسم کے افراد اکثریت میں ہوں یا حاکم ہوں تو پھر سارا معاشرہ ہی فساد و تضاد کا نمونہ بن جاتا ہے - انسانی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا اہم پہلو ہو جس کے بارے میں قرآن نے رائے نہ دی ہو لیکن ان آراء و اقدار میں ایک باہمی ربط ہے جو اسلام کا نظریۂ زندگی پیدا کرتا ہے اور اس طرح انسان کو تضادِ فکر و عمل سے بچاتا ہے - چونکہ یہ اقدار انسانی زندگی کے ہر ممکن پہلو سے متعلق ہیں اور ہم آہنگ بھی ہیں - لٰہذا اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ اقدار کہنا کوئی بے بنیاد دعویٰ نہیں -

اسلام کا فلسفۂ زندگی قرآن کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں - جیسا کہ پہلے بھی یہاں بیان کیا گیا ہے اس فلسفۂ میں توحید اور خلافت آدم کو اساسی حیثیت حاصل ہے - یہ ساری کائنات ایک زندہ و فعال خدا نے بنائی ہے اور اس میں اپنے غیر متبدل اور ہم آہنگ قوانین کے ذریعے ایک بے مثال ضبط و نظم قائم کیا ہے - **ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفٰوت ـ فارجع البصر ھل تریٰ من فطور ـ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئًا و ھو حسیر** [۶۷ : ۴، ۳] - یعنی شفیق و رحیم خدا کی تخلیق میں کوئی خامی نہیں - ذرا ایک بار نگاہ ڈال کر دیکھ لو شاید کوئی نقص دریافت کر سکو - ایک بار پھر دیکھ لو لیکن نگاہیں عاجز اور بے بس ہو کر واپس لوٹ آئیں گی - یہی وہ خالق کائنات ہے جس نے انسان کو اپنا نائب بنا کر اسے بے شمار دوسری مخلوقات پر فوقیت دی ہے اور اسے حق نیابت ادا کرنے کے قابل بنانے کے لیے خارجی اور اندرونی طاقتوں سے نوازا ہے - **الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض و اسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ و باطنۃ** [۳۱ : ۲۰] کیا اللہ نے تم سب کے لیے وہ تمام قوتیں مسخر نہیں کر دیں جو زمین و آسمان پر پھیلی ہوئی ہیں اور تمھیں ہر قسم کی ظاہری اور باطنی نعمتوں سے نہیں نوازہ - جہاں تک خارجی قوتوں اور قدرتی وسائل کا تعلق ہے وہ انسان کے علم کے تابع کر دیے گئے ہیں - جیسا کہ ملائکہ و آدم کے قصّے سے ظاہر ہے - **و علم آدم الا سماءٓ کلھا** [۲ : ۳۱] - اور جہاں تک باطنی قوتوں کا تعلق ہے وہ انسان کے اعمال صالحہ اور ذاتی کردار سے پیدا ہوتی ہیں - **قد افلح من زکّٰھا و قد خاب من دسّٰھا** [۹۱ : ۱۰] : یعنی جس نے اپنے کردار کو بے داغ رکھا اور اس کی نشو و نما کی وہ کامیابی سے ہمکنار ہوا اور جس نے اس کی نشو و نما کو روک دیا وہ برباد ہوا -

ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی اور اس کے مظاہر میں انسان کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے اور اس مقام کو برقرار رکھنے کے لیے اسے خارجی اور اندرونی یعنی مادی اور روحانی وسائل سے نوازہ گیا ہے ۔ لہذا ان وسائل کی حفاظت ، نشو و نما اور صحیح استعمال انسانی زندگی کے اہم ترین مقاصد ہیں ۔ چنانچہ قرآنی نظام فکر جن اقدار پر مشتمل ہے ان کا بنیادی نقطہ انہی مقاصد کا حصول ہے ۔ جو اعمال انسان کو یہ اونچا مقام حاصل کرنے سے روکتے ہیں، وہ نا قابل قبول ہیں اور جو اس کے حصول میں مدد گار ثابت ہو سکتے ہیں وہ لازمی ۔ انسان اگر چاہے تو خدا کی طرف سے عطا کردہ قوتوں اور صلاحیتوں کو اپنی بقا اور نشو و نما کے لیے استعمال کرے اور اگر چاہے تو ان سے غفلت برتے یا انہیں ضائع کر کے برباد ہو جائے ۔ ایک اور قابل غور نقطہ یہ ہے کہ مادی اور روحانی ترقی کی کوئی حد نہیں ہے ۔ آخرت کا نظریہ جہاں انسانوں میں جواب دہی اور ذمہ داری کے احساسات پیدا کرتا ہے وہاں زندگی کو ایک جوئے رواں قرار دے کر عمل فروغ و فراغ کے جاری رکھنے کی ضمانت بھی دیتا ہے ۔ **فلهم اجر غير ممنون** [۹۵ : ٦] یعنی افکار و اعمال کو اسلامی اقدار کے مطابق ڈھالنے کے نتائج ختم ہونے والے ہیں ۔ یہ ہے وہ بنیادی فلفسۂ زندگی جو اسلام کے اخلاقی ، سیاسی ، معاشی ، روحانی اور دیگر اقدار کا سرچشمہ ہے ۔

اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق خدا کی عطا کردہ خارجہ نعمتوں سے استفادہ کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا باقی نعمتوں سے ہے یہ خارجی نعمتیں اُن قدرتی وسائل پر مشتمل ہیں جن سے انسان کسب معاش کرتا ہے ۔ لہذا یہ ضروری ٹھہرا کہ ان وسائل سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے ۔ قابل کاشت زمین ہو یا دھاتوں کے خزانے ۔ تند خو سمندر ہوں یا وسیع و عریض فضائیں ، نباتات و جمادات کے ذخیرے ہوں یا حیوانات کی قسمیں ۔ کھلی وادیاں ہوں یا بلند و بالا پہاڑ ۔ ان سب سے کام لے کر معیشت کو مضبوط و مستحکم بنانا منشائے ایزدی کے مطابق معلوم ہوتا ہے ۔ سورہ **الرحمٰن** کو پڑھ لیجیے ۔ یا احادیث نبوی کا مطالعہ کر لیجیے ، وسائل کو انسانوں کی بہتری کے لیے استعمال میں لانا شکرانہ نعمت کے مترادف ہے ۔ کیا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردہ زمینوں کو کاشت کرنے ، پھل دار درخت لگانے اور ہر مسلمان کو اپنے ہاتھوں سے کمائی کرنے کی بار بار تاکید نہیں کی ہے ۔ ایک حدیث نبوی ہے ۔ **ان الله يحب الموسن المحترف** ۔ یعنی اللہ ہنر پیشہ مومن کو دوست رکھتا ھے ۔ اس مضمون کی بھی روایات ہیں کہ پیغمبر اسلام لوگوں کی معاشی پریشانی دیکھ کر پریشان ہو جاتے تھے اور جب تک ان کا کوئی بندوبست نہ کرا لیتے ، چین سے نہ بیٹھتے تھے ۔ اور جب کسی کو خوش حال دیکھتے تھے تو آپ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھتا تھا ۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ غربت و ناداری کو اسلام نے کبھی پسند نہیں کیا ۔ بلکہ اسے ایک برائی سمجھا ہے ۔ **و من اعرض عن ذكرى فان له معيشة**

ضنکا [۲۰ : ۱۲۴] - یعنی جو ہمارے پیغام سے منہ موڑتا ہے اس کی روزی تنگ کر دی جاتی ہے - یہ ایک بہت معنی خیز آیت ہے - جو ہماری پس ماندہ معیشت پر ایک اہم خدائی تبصرے کے مترادف ہے - یہ بھی درست نہیں کہ اسلام صرف ضروریات کی حد تک معاشی جد و جہد کا قائل ہے ، یہ جو حکم ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد **فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ** [۶۲ : ۱۰] - یعنی زمین کے چاروں طرف اللہ کے فضل کو تلاش کرنے کے لیے نکل پڑو تو یہاں فضل کی نوعیت کو ہرگز ضروریات تک محدود نہیں کیا گیا - اس طرح ایک اور جگہ کہا گیا ہے - **قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق** [۷ : ۳۱] - یعنی وہ کون ہے جو انسانوں کو اس بات سے منع کرتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ پاکیزہ رزق نہ کھائیں اور سامان زیبائش و زینت نہ استعمال کریں -

اسلام کا منشا صاف طور پر دکھائی دیتا ہے کہ ایک ایسا انسانی معاشرہ تشکیل دیا جائے جس میں مادی اور روحانی قوتوں کی پرورش کا پورا سامان موجود ہو ، جس میں معاشی ترقی کچھ اس انداز سے ہو کہ ہر شخص اس سے یکساں طور پر مستفید ہوتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے - جس میں ارتکاز دولت کی کوئی گنجائش نہ ہو اور ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جو معاشی دولت کو گردش میں رکھیں جس کی بنیاد مساوات قانون عدل و انصاف ، احسان اور تعاون پر ہو اور جس میں معاشی جد و جہد زندگی کی بنیادی اقدار کے تابع ہو - اگر غور سے دیکھا جائے تو ان اقدار کا رخ جس منزل کی جانب ہے وہ ایک ایسی عوامی فلاحی مملکت کا قیام ہے جس میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہو - بلکہ سب ایک ہی نظریۂ حیات سے متاثر ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے تعاون کریں - سب کو فنی مہارت اور اکتساب رزق کے مواقع ملیں - لیکن دولت کا انبار اکٹھا کرنے کی اجازت نہ ہو - روزانہ اذانوں میں **حی علی الفلاح** کی جو آواز دی جاتی ہے وہ اسی منزل کی طرف دعوت ہوتی ہے - تاریخ ہمیں رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے زمانے کے بارے میں جو کچھ بتاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آچکا تھا جو متذکرہ صدر اقدار کی سچی تصویر پیش کرتا تھا - یہ اسی مختصر سے دور کا جذب دروں تھا جس نے اسلامی تہذیب کو ایک ہزار سال تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رکھا - اسلام نے نہ صرف قریش کو غربت و افلاس اور غیر محفوظ حالات سے نکالا جس کا ذکر قرآن مجید نے یوں کیا ہے - **فلیعبدوا رب ھذا البیت الذی اطعمھم من جوع و آمنھم من خوف** - بلکہ سارے عرب گھرانوں کو خوش حالی سے ہمکنار کر دیا - اور جہاں تک اسلامی تہذیب کے عروج کے زمانے کا تعلق ہے اس دعویٰ میں شاید کوئی مبالغہ نہیں کہ اس دور میں زراعت و باغبانی ، صنعت و حرفت - سیر و سیاحت اور علوم و فنون کو وہ عروج نصیب ہوا کہ ہسپانیہ سے لے کر جنوب مشرق ایشیا کے سواحل تک کے علاقے معاشی طور پر ترقی یافتہ کہلانے لگے اور دنیا میں صحیح معنوں میں بین الاقوامی تجارت اور عالمی صنعتی ٹیکنالوجی کی بنیاد پڑی - جس نے آگے چل کر یورپ کے

صنعتی انقلاب کو ممکن بنایا ۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں علم اقتصادیات کی بنیادیں رکھی گئیں اور مسلمان مفکرین نے سیاست ، تمدن و تدبیر منزل اور المعاش کی اصطلاحیں ایک نئے علم کے مباحثہ کے لئے استعمال کیں ۔

اگر اسلام نے معاشی ترقی و بہبود کو اپنے فلسفۂ زندگی کا ایک اہم حصہ نہ بنایا ہوتا ، تو پھر تاریخی حقائق کچھ مختلف ہوتے اور لارھبانیة فی الاسلام کے ارشاد کی ضرورت نہ ہوتی ۔

قرآنِ مجید کا ہنوز مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی اقتصادی نظام جن اقدار پر استوار ہوگا وہ یہ ہیں :

(الف) **تقویٰ** یعنی ذاتی منفعت اور زر و مال کی پرستش کی بجائے پرہیزگاری کا راستہ اختیار کرنا اور اسلامی اصولوں کے تحت دوسروں کے لیے کام کرنا ۔

(ب) **اخوت** جس سے سارا معاشرہ برادرانہ رشتوں میں منسلک ہو جاتا ہے ۔

(ج) **مساوات** جس سے یہ مقصود ہے کہ اکتسابِ رزق کے مواقع سب کے لیے یکساں طور پر موجود رہیں اور معاشی ناہمواریاں ناپید ہو جائیں ۔

(د) **عدل و انصاف** یعنی ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پھل ملے اور معاشرہ فساد و انتشار سے محفوظ رہے ۔

(ہ) **احسان** یعنی نادار ، کم اہل اور کم استطاعت رکھنے والے افراد کی طرف وسائلِ رزق کا اس طرح منتقل کرنا کہ وہ مستقل طور پر معاشرہ کے کارآمد اراکین بن جائیں ۔ ظاہر ہے کہ اس کام کی ذمہ داری زیادہ استطاعت رکھنے والے افراد پر ہوگی ، جنھیں تقویٰ کے اصول کے تحت خوش دلی اور فراخ دلی سے اپنی کمائی کا حصہ ملی مفادات کے لیے مختص کرنا ہوگا ۔

(و) **تعاون** جو مال و اسباب کی پیداوار اور تقسیم سے متعلق تنظیمی ڈھانچوں کے لیے بنیاد کا کام دے گا ۔

(ز) **باھمی مشاورت** یعنی جبر و اکراہ اور چند افراد کی بالا دستی کی جگہ جمہوری طرزِ فکر و عمل اختیار کیا جائے گا ۔

قرآنِ مجید نے اسلام کے لیے ان اقدار کا واضح طور پر ذکر کیا ہے ۔ البتہ ان کی بنیاد پر جو معاشی نظام متشکل ہوگا اس کی تفصیلات دینے کی بجائے چند اہم بنیادی اصول دیے ہیں جو یہ ہیں : اول ، معیشت کی اساس ربا کی بجائے تجارت کے

اصول پر ہو - دوم ، فلاح و بہبود اور سماجی ترقی کے لیے جو مالی وسائل درکار ہوں وہ زکوٰۃ و صدقات کے وسیع نظام سے مہیا کیے جائیں - سوم ، مال و دولت کی گردش اس طرح کی جائے کہ امراء کی بجائے تمام افراد ملت یکساں طور پر فائدہ حاصل کریں - چہارم ، معاشرہ ہر شخص کے لیے رزقِ کریم حاصل کرنے کے مواقع مہیا کرے - یعنی ایسی روزی جو عزت و آبرو کے ساتھ حلال ذرائع سے حاصل کی جا سکے - پنجم ، ہر شخص اپنی کمائی میں سے ضروری اخراجات پورا کرنے کے بعد باقی حصہ قوم و ملک کے لیے چھوڑ دے - ششم ، مال و جائداد قرآن کی رو سے تسلیم شدہ حصہ داروں میں تقسیم کیا جائے تاکہ غیر ضروری ارتکازِ دولت نہ ہو - ہفتم ، صرفِ دولت کی بنیاد اسراف و تبذیر کی بجائے ایک متوازن طرزِ عمل پر ہو -

یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ کفالت عامہ سے متعلق اسلام کی اعلیٰ و ارفع اقدار اور اصول ایک مثالی سماج کے طلبگار ہیں لیکن اس کے برعکس ہمارے معاشی اور معاشرتی مسائل فوری توجہ کے محتاج ہیں لیکن سوال یہ ھے کہ انسانوں کے مسائل کو فوری طور پر حل کرنا ممکن بھی ہے - انسان کی فکری مناسبت سے اسلام اسے اپنی طرف بتدریج بلاتا ہے - خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق کار اس بات کا گواہ ہے - اصل کام کرنے کا یہ ہے کہ اسلام کی اقدار کو اچھی طرح سمجھ کر ان کی روشنی میں موجودہ اقتصادی نظام کی خصوصیات کا الگ الگ اور مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے - اور اس کے ڈھانچہ کے جو خدو خال اسلام کی قدروں کی نفی کرتے ہیں انھیں تبدیل کر دیا جائے - اور ان کی جگہ متبادل انتظام کیے جائیں - انفرادی ملکیت ہو یا قومی ملکیت - بنکوں کا موجودہ نظام قائم رہے یا کوئی اور سرمایہ کاری کے لئے سود کی جگہ کون سا متبادل انتظام کیا جائے کہ معیشت مالی بحران سے بچی رہے - بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو فروغ دیا جائے یا چھوٹی صنعتوں کو - زمین کی حد ملکیت کیا ہو اور مزدوروں کی اجرتوں کی کیا سطح ہو- تجارتی منافعوں کو مناسب حدود میں رکھنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں - بیرونی اور اندرونی تجارت پر کس کا کنٹرول ہو - مکانات کرایہ پر دینے کا موجودہ طریقہ رائج رہے یا نہیں - یہ اور اس قسم کے دوسرے اہم سوالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کے متعلق اقتصادی ڈھانچوں اور تنظیموں کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لیا کہ آیا یہ انسان کو ترقی و تعمیر کی اس بلند و بالا منزل کی طرف لے جائیں گے جو اسلام نے متعین کی ہے -

ظاہر ہے کہ اسلامی نظام کا جو بھی معاشی ڈھانچہ بتدریج ابھرے گا اسے لوگوں کو خوش حال بنانے کے لئے دو بنیادی مقاصد سامنے رکھنے ہوں گے -

ایک قومی رزقِ کریم میں اضافہ یعنی اسلامی معاشرے کی قومی آمدنی میں اضافہ -

دوسرا اس رزقِ کریم کی عدل اور احسان کی بنیادوں پر منصفانہ تقسیم -

اس سلسلے میں دوسری قوموں کے معاشی تجربات سے بھی استفادہ کرنا ہوگا اور اسلام کی دی ہوئی انسانی قدروں کے مطابق موجودہ اقتصادی اداروں اور تنظیموں کی

تشکیل نو بھی کرنا ہو گی ۔ علامہ اقبال کی ہم نوائی کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام در حقیقت ایک جدید فقہ کی تدوین و تربیت کا طالب ہے ۔ اس ضمن میں بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ جدید منصوبہ بندی کے تجربوں اور اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک جامع اسلامی اقتصادی اور ساجی ترقیاتی پروگرام مرتب کیا جائے ۔ جس میں ایک طویل المیعاد منصوبے کے تحت مقاصد ، پالیسیوں اور ذرائع کار یعنی (Objectives, Policies and Instruments) کی اس طرح نشان دہی کی جائے کہ ان میں باہمی ربط اور یکسانیت ہو ۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایک جامع اور ہمہ گیر منصوبے کے بغیر بعض اہم اقدامات جس کا تعلق سود اور زکوٰۃ و عشر ایسے اہم معاملات سے ہے رکاوٹ کا شکار بن سکتے ہیں ۔

یہ امر خوش آئند ہے کہ احیائے اسلام کی موجودہ تحریکوں کے زیر اثر پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک میں اسلامی اقتصادی نظام قائم کرنے کی طرف چند اہم قدم اٹھائے گئے ہیں ۔ مثال کے طور پر سوڈان ، مصر ، سعودی عرب ، کویت اور پاکستان میں بعض اقتصادی شعبوں میں سودی کاروبار ختم کر دیا گیا ہے اور چند غیر سودی بنک اور مالی ادارے قائم کیے گئے ہیں ۔ اسی طرح حال ہی میں پاکستان میں عید میلادالنبی کے مبارک موقع پر زکوٰۃ و عشر کے بارے میں اہم فیصلوں کا اعلان کیا گیا ہے ۔ جس کے نتائج بہت دور رس ہوں گے ۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کا اقتصادی نظام محض زکوٰۃ و عشر کے نفاذ کا نام نہیں اور نہ ہی سودی کاروبار سے نجات حاصل کرنے تک محدود ہے ۔ اس سے مراد ایک ایسے وسیع تر معاشرہ کا قیام ہے جس کی تعمیر و ترقی اخوت ، مساوات ، عدل و انصاف ، تعاون اور باہمی مشاورت کی روشن اور انسان پرور قدروں پر ہو ۔ لہذا لازمی ہے کہ اس سمت میں جو بھی قدم اٹھائے جائیں وہ ایک ہمہ گیر منصوبے کے تحت سوچ سمجھ کر اٹھائے جائیں ۔ تاکہ وہ مؤثر اور خوشگوار نتائج پیدا کر سکیں ۔ جس کی اس وقت اسلامی دنیا کو اشد ضرورت ہے ۔

اگر دریا کوزہ میں بند کرنے کے محاورے کو سامنے رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ دور حاضر کے بنیادی معاشی مسائل فقط دو ہیں ۔ ایک معاشی اشیاء اور خدمات کی پیداوار میں بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر مسلسل اضافہ (growth) اور دوسرا معاشی پیداوار اور ذرائع کی تمام انسانوں میں منصفانہ اور مساویانہ تقسیم (equity) انہی مسائل کے حل نہ ہونے کی وجہ سے دنیا ایک نئے عالمی اقتصادی نظام کی تلاش میں سرگرداں ہے ۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان مسائل کا حل اسلام کی معاشی اقدار کی پیروی میں پوشیدہ ہے ۔ لیکن ان اقدار کی اساس پر جو بیرونی معاشی ڈھانچہ تعمیر ہونا چاہیے وہ اس بات کا طلبگار ہے کہ مسلمان مفکرین اور فقہاٴپھر ایک بار اسی اجتہادی فکر و نظر سے کام لیں جس نے سینکڑوں سال قبل اسلامی فقہ ایسی عظیم الشان عمارت تعمیر کی تھی ۔